

غیاثِ مستین

دُھوپ
دیواریں
سمندر
انہی

87
1-94

شعری جملہ

دھوپ، دیواریں، سمنہ، آئینہ

غیاث متین

جملہ حقوق بیگم سیدہ فرحانہ غیاث متین کے نام محفوظ

○ سنہ اشاعت: دسمبر ۱۹۹۳ء

○ بکراؤل — پانچ سو A C C N ۵۰

373

○ سرورق: عزیز آرٹسٹ

○ خوشنویسی: سلاطین خوش نویس

○ طباعت: اسپڈ پرنٹس، آفیسٹ پرنٹس اینڈ باندھن 873538

○ قیمت: ستاھ روپے

○ ناشر: مکتبہ شعر و حکمت

6-5-659/2 سائبان - کپاڈیلین - پنج گٹ - حیدرآباد 482 500

○ تقسیم کار:

○ حساحی بک ڈپو، مچھلی کمان - حیدرآباد

○ حیدرآباد لٹریچر فورم حلف ڈریس لینڈ، عابدس - حیدرآباد

○ مکتبہ جامعہ سیٹ، جامعہ گورنمنٹ - نئی دہلی

○ شاخیں — علی گڑھ، دہلی، بمبئی

○ شب فون کتاب گھر - رانی منڈی - الہ آباد

○ نصرت پبلشرز، حیدری مارکٹ - امین آباد - لکھنؤ

○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکٹ - علی گڑھ

○ بک ایسپوریم - سبزی باغ - پٹنہ

○ مصنف: 536/3-8-16 تجدید ملک پیٹ - حیدرآباد

DHOOP, DEEWAREN, SAMMANDER, AAINA

GHYAS MATEEN

Edition: 1993 - Price: Rs 60/-

Publisher

MAKTABA-E-SHER-O-HIKMAT

Somajiguda, Hyderabad-500 482

{ مجزوی انت
اردو اکیڈمی
انڈیا پرنٹرز
حیدرآباد

اِنْتَسَاب

حیدر آباد لٹری فرم
”حَلَف“

۷

نام

میرا خواتین بھو ہے اور تعبیر بھی

مَعْنَوْنَ

نئی نسل

۷

نام

جس کے شعری ذوق پر مجھے بھرپور اعتماد ہے

فہرست

میرے احساس کی نہکت، مرے فن کی خوشبو ۳۱

کاغذوں کے ٹکڑوں سے آئینہ بناتے ہیں ۳۲

اب جو ملتا ہے تو وہ شخص کھٹ ڈر لگتا ہے ۳۳

نُخشک دریاؤں کو پانی دے گیا ۳۴

نیرنگ کب اچھی لگی، کب جاگت اچھا لگا ۳۵

دریا سے بچانا، نہ سمندر سے بچانا ۳۶

مراد سرائخ دکھا دے مجھے ۳۸

کاغذ اُچھال کر ذرا تیور ہوا کے دیکھ ۳۹

جن سے آواز کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا ۴۱

اس طرف آگ کا دریا ہے، اُدھر کھاتی ہے ۴۳

ان پرندوں کے سبق سیکھا کرو ۴۵

میں سوچوں تجھ کو اور سوچا نہ جلتے ۴۷

اب یہ حسرت ہے کہ منظر کوئی ایسا دیکھوں ۴۸

وہ چنگاریوں کو ہوا دے گیا ۴۹

موسموں کی طرح دل سے مرے جانے والا ۵۰

آئینہ مانگوں تو کیسی وہ نثر دیتا ہے ۵۲

آئینہ بن کے بات کرتی دھوپ ۱۳

ایک لاکھ رہے کیوں رہتے ہو، کیا دیتی ہیں دیواریں ۱۵

پاگل سی ہوا، ڈھلتی ہوئی شام، سمندر ۱۷

دیکھتا ہے جب بھی پتھر آئینہ ۱۹

پرندوں کو اب نہ پھیلاؤ پرندو ۲۱

آگے نکلوں پہنچ گئی، جھگنو ۲۲

ہم سے کیا پوچھتے ہو، کیا ہے رات ۲۳

کیوں کسی کو ڈھونڈتے ہو، ہاتھ میں لے کر چراغ ۲۴

کہیں چراغ، کہیں آئینہ بنا اخبار ۲۵

اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہا، کورا کاغذ ۲۶

کہیں خیال، کہیں خواب سا ملا دریا ۲۷

بھینگنے کا اک مسلسل سلسلہ بارش میں ہے ۲۸

اکیلی پھرتی ہے آنکھوں میں لے کے پانی شام ۲۹

شام کا رنگ جو گہرا ہوا آئینے میں ۳۰

غزلیں

خود اپنے شکنجے میں گرفتار نہ ہونا ۵۸
 کیا ہوا پوچھیں، تو وہ کچھ بھی نہیں کہتی ہے ۶۰
 دل جلا پھر چرلے جلتے ہی ۶۲
 دشمن کو بھی یار بنا کر دکھیں گے ۶۴

لہجے کو پھول، لفظ کو جگنو، اگر کریں ۵۳
 کوئی سایہ، نہ خوشبو، مگر دیکھنا ۵۴
 شعلے بھج جائیں گے، چنگاری دہی رہ جائے گی ۵۶
 یہی نہیں کہ نقطہ در بدر گئے ہوتے ۵۷

نظمیں

پزندو، چلو لٹ آڈ ۹۷
 اپنے آپ سے ایک مکالمہ ۱۰۰
 ایک نظم — زمین والوں کے نام ۱۰۴
 وہ ایسا آئینہ تھا ۱۱۲
 بولتی لکیریں ۱۱۷
 کلام رد رہا ہے ۱۲۰
 ایک نظم — انور رشید کے نام ۱۲۴
 تمہاری گفتگو ہوگی چراغوں سے ۱۲۶

سفر ہے شرط ۶۸
 زخمی سڑک ۷۲
 شہر یا رام روز ۷۶
 صدائے طور ۸۰
 وقت ۸۴
 وہ قاصد مرچکا ہے ۹۰
 ریس ۹۲
 کھل جا سم سم ۹۵



اپنے پہلے شعری مجموعے ”زمینِ زینہ راکھ“ ۱۹۸۰ء کی اشاعت کے تیرہ سال بعد یہ دوسرا شعری مجموعہ — ”دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ“ — اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے، میں بڑی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ ان تیرہ برسوں میں، جدید اظہار نے نہ صرف اپنے عصر کو متاثر کیا ہے بلکہ اپنے آپ کو منوالیا ہے۔

پچھلے مجموعے میں غزلیں بھی شامل تھیں جو تعداد میں بہت کم تھیں — غالباً اسی لیے میری شناخت ایک نظم گو کی حیثیت سے ہوئی۔ باذوق قاری اور نقاد ان فن کی جانب سے جدید نظم گو شاعر کی حیثیت سے میری جو پذیرائی ہوئی، اُس نے مجھے حوصلہ بخشنا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد شعوری یا لاشعوری طور پر میں نے غزل کی جانب توجہ کی — غزل جو ایک جادوئی صنف ہے، اپنے اندر ایک جہانِ معانی رکھتی ہے پچھلے بیس پچیس برسوں میں غزل نے اپنے اسلوب اور اظہار کے امکانات کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ عصر کی آگہی اور اس کے مسائل نے جدید غزل گو شاعر کے اظہار اور اس کے وزن کو ذات اور کائنات سے ہم رشتہ دہم آہنگ کر دیا ہے — جدید غزل نے پچھلی رُبع صدی کے دوران جس طرح اپنے آپ کو منوالیا ہے، اس طرح پوری اُردو شاعری کی تاریخ میں کسی اور صنف نے اپنے آپ کو نہیں منوالیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غزل کی اندرونی ہیئت میں تبدیلی ہے، جس میں اظہار کے اسلوب، استعداداتی اور علاقائی انداز بیان، نئے الفاظ اور تراکیب کی شمولیت، نئی زبان کی تخلیق، روزمرہ واقعات اور مسائل کا تخلیقی اظہار، سبھی کچھ شامل ہے۔ اپنے ہم عصر جدید غزل گو شعرا کی طرح میں نے بھی غزل کی

اندرونی ہیئت کو بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

میری شاعری میں لفظ کو اس کے لغوی اور اکہرے معنی میں استعمال کرنے کے بجائے اُسے علامت اور استعارے کے طور پر تے کا عمل آپ کو ملے گا۔ ”دھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ“ صرف چار لفظوں پر مشتمل ایک مصرعہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ اپنی جگہ مکمل استعارے اور علامتیں ہیں جن کا ہمارے تمدن کی تاریخ سے راست تعلق ہے۔ گویا یہ استعارے اور علامتیں اپنے تمدن کی تاریخ کا منظر ہیں۔ ان کلیدیہ استعاروں اور علامتوں کے علاوہ ’میری شاعری میں‘ موسم، پرندے، دریا، شجر، ثمر، جگنو، رات، شام، چراغ، کاغذ، پتھر، شاخ، پھول، پتے، پھل، تنہائی، دہلیز، گھر اور ایسے ہی دیگر الفاظ، کہیں انفرادی اور اجتماعی لا شعور کے علامت ہیں۔ کہیں ذات اور کائنات کے حیرت زا مظاہر کی استعاراتی تصویریں تو کہیں میرے عصر کے، سیاسی، سماجی اور تہذیبی عناصر، عوامل اور مسائل کے تخلیقی اظہار کی علامتیں ہیں۔ میں نے اس مجموعے کی ابتدائی چند غزلوں میں استعاروں اور علامتوں ہی کو ردیف بنانے کا تجربہ کیا ہے۔ یہ تجربہ کوئی نیا نہیں ہے۔ اساتذہ اور خاص طور پر جدید تر شعراء کے ہاں اس طرح کے نمونے ہمیں مل جاتے ہیں۔ لیکن اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک شعری مجموعے میں اس طرح کی ردائف کا استعمال شاید پہلی بار ہوا ہے۔

تخلیقی عمل ایک نہایت ہی پیچیدہ عمل ہے جس میں صرف تخلیق کار کی ذات موجود رہتی ہے۔ اس سلسلے میں نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تخلیقی عمل کے ابتدائی مرحلے پر میرے ذہن میں کوئی *image* اپنی مکمل شکل میں در آتا ہے جسے میں لفظوں کا پیر بن دے دیتا ہوں۔ دوسرے معنی میں اپنی غزلوں کے بیشتر اشعار میں، شعری یا لا شعوری طور پر میں نے *Images* کی تخلیق کی ہے۔ ان میں سے جو شعری پیکر میں نے تراشے ہیں اگر ان کی ترسیل میں کامیاب رہا ہوں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

جہاں تک نظم کا سوال ہے۔ نظم اپنی ایک شناخت بلکہ شخصیت رکھتی ہے۔ جس کی تشکیل موضوع اور ہیئت کی ہم آہنگی سے ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل اپنی نظموں میں میرا

تخلیقی عمل پسیر کی تجسیم ہے۔ کوشش میں نے ہی کی ہے کہ موضوع اور ہیئت میں ہم آہنگی پیدا کر سکوں۔ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ تو آپ ہی بتا سکیں گے۔

آئیے۔۔۔ میرے تخیل کے سمندر میں بنی ہوئی ان دیواروں سے صفحہ قرطاس پر اُترتی ہوئی احساس کی دھوپ کو پی کر اس آئینے میں جھانکیں جو میری تخلیق بھی ہے اور میری ذات کا اظہار بھی !
 ناسپاس گزاری ہوگی، اگر میں استاذی محترم ڈاکٹر منغی تبشیم کا شکریہ ادا نہ کروں۔ جن کی شفقت میری ذہنی تربیت اور شعری ذوق کا حصہ ہے۔ سلام خوش نویس کی خوش نویسی اور عزیز آرسٹ کے سرورق نے اس مجموعہ کے ظاہری حسن میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ میرے عزیز دوستوں محمود انصاری، ایڈیٹر روزنامہ منصف، حیدرآباد۔ ڈاکٹر بیگ احساس، ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی۔ ڈاکٹر مقبول فاروقی، ریڈر شعبہ اردو آندھرا یونیورسٹی و شاکھا پٹنم نے اس مجموعے کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا، اور مفید مشوروں سے نوازا۔ جس کے لیے میں ان سب کا شکریہ گزار رہوں۔

غیاث مستین

{ غیاث مستین }

دسمبر ۱۹۹۳ء
حیدرآباد

شہر کب آئے، کہاں ٹھہرے ہو، یہ کیا حال ہے
 اُس کا مجھ کو روک کر یہ پوچھنا اچھا لگا

غیاث مستین



اپنے، بھجے کی تہی پہچان ہے
دُھوپ، دیواریں، سمندر، آئینہ

غیاث متین



اُتیسہ بن کے بات کرتی دھوپ
دل کی دیوار پر برستی دھوپ

میرے اندر بھی دھوپ کا عالم
میرے باہر بھی رقص کرتی دھوپ

اُس کی آنکھوں میں خیمہ زن دیکھی
ایک اک بوند کو ترستی دھوپ

اُتیسہ دیکھ کر ٹھٹھکتی ہے
گھر کی دیوار سے اُترتی دھوپ

طاقِ ماضی میں چھپ کے بیٹھی ہے
خوف سے کانپتی، لرزتی دھوپ

صُبح کو شام سے ملاتی ہے
رقص کرتی ہوئی، تھرکتی دُھوپ

خواب ہے یا سَراب ہے کیا ہے
اپنے ہی عکس کو ترستی دُھوپ

عکس آنکھوں میں چھوڑ جاتی ہے
سامنے سے برے گزرتی دُھوپ

آئینہ بھی ہے اور سمندر بھی
میرے احساس میں اُترتی دُھوپ

میں بھی اُس کی زباں سمجھتا ہوں
جب بھی مجھ سے ہے بات کرتی دُھوپ

اپنا لہجہ مستین ایسا ہے
جیسے دریاؤں میں اُترتی دُھوپ!



اکیلا گھر ہے، کیوں رہتے ہو، کیا دیتی ہیں دیواریں
یہاں تو سنسنے والوں کو، رُلا دیتی ہیں دیواریں

انہیں بھی اپنی تنہائی کا جیٹا احساس ہوتا ہے
تو گہری نیند سے مجھ کو، جگا دیتی ہیں دیواریں

بچھے ماضی کا کھلتے حال سے رشتہ عجب دیکھا
کھنڈر خاموش ہیں لیکن صدا دیتی ہیں دیواریں

ہوا کے زخم سہہ کر بارشوں کی چوٹ کھا کھا کر
چھتوں کو، روزنوں کو آسرا دیتی ہیں دیواریں

رہوں گھر میں تو میرے سر پہ چادر تان دیتی ہیں
سفر پر جب نکلتا ہوں دُعا دیتی ہیں دیواریں

جو چلتا ہی نہ چاہے، روک لیتے ہیں اُسے ذرے
بگولوں کو سفر میں راستہ دیتی ہیں دیواریں

وہ ساری گفتگو جو بند کمروں ہی میں ہوتی ہے
میں جب باہر سے آتا ہوں سُنا دیتی ہیں دیواریں

اُترتی اور چڑھتی دُھوپ کی پہچان ہے ان کو
ابھی دن کتنا باقی ہے بتا دیتی ہیں دیواریں

مستینِ اس چلچلاتی دُھوپ میں سایہ انہی سے ہے
میں جب بھی ٹوٹتا ہوں، حوصلہ دیتی ہیں دیواریں



پاگل سی ہوا، ڈھلتی ہوئی شام، سمند
ایسے میں کہیں لے نہ ترانا نام، سمند

ویرانوں میں بھٹکیں کہ ترے شہر میں ٹھیریں
آنکھوں میں در آتا ہے سرِ شام، سمند

ہے تازہ ہواؤں پہ یہ الزام کہ چپ ہیں
کچھ ایسا ہی تجھ پر بھی ہے الزام، سمند

کاغذ کی بنی ناؤں میں بیٹھے ہوئے ہم لوگ
گرداب سے نکلے ہیں ذرا تھام، سمند

دے اذن کہ پانی پہ مکاں اپنے بنائیں
اب ساری زمیں ہو گئی نیلِ سلام، سمند

سُنتے ہیں دہاں عکس اُبھرتے ہیں بدن کے
چلتے ہیں چلو ہم بھی سہِ شام، سمندر

کس وقت زمیں میرے قدم لینے لگی ہے
جب رہ گیا مٹی سے بس اک سگام، سمندر

تو عکس فلک ہے تو فلک آئینہ تیرا
اک رقصِ مسلسل ہے ترا سگام، سمندر

چڑھتے ہوئے دریا ہوں کہ سُکھی ہوئی نہریں
رکھتے ہیں ترے سہِ سبھی الزام، سمندر

کیا جگر کے پانی سے لبِ کوستہ
دینے لگے حشرِ اولیٰ کو دُشنام، سمندر



دکھتا ہے جب بھی تیرے آئینہ
بات کرتا ہے سنبھل کر آئینہ

آئینے سے دوستی ابھی نہیں
کہہ رہا ہے میرے منہ پر آئینہ

پھلتے پھرتے منظرِ دلوں کا سلسلہ
آئینہ، در آئینہ، در آئینہ

ہیں سبھی دیوار سے لٹکے ہوئے
وقت، تصویریں، کیلنڈر، آئینہ

شام کے ہونٹوں پہ سُرخ کی لکیر
راست کے پر دلوں کے اندر آئینہ

کوئی اس سے ٹوٹ کر ملتا نہیں
جاگتا رہتا ہے شب بھر آئینہ

اُن کی آنکھوں کا مقدر دُھوپ ہے
سیڑی آنکھوں کا مقدر آئینہ

اپنے بلجے کی یہی پہچان ہے
دُھوپ، دیواریں، سمندر آئینہ

عکس جن کو تم سمجھتے ہو مستین
آئینے کے بھی ہے اندر آئینہ



پر دل کو اب نہ پھیراؤ، پرندو
ہے بارش تیز، گھر جاؤ، پرندو

سمندر، دانہ دانہ جب بکھرے
سمندر میں اتر جاؤ، پرندو

وہ موسم تو نہ آئیں گے پلٹ کر
چلو، اب لٹ بھی آؤ، پرندو

مجھے سُرخاب کے پر کی ہے خواہش
کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ، پرندو

ہواؤں میں مستین اُڑنے لگا ہے
ذرا تم اس کو سمجھاؤ، پرندو



اُکے پلکوں پر تھم گئی، جُگنو
میرے اَنفاس میں بسا جُگنو

میری مٹھی میں بند ہے اب تک
تیسری یادوں کا بے بہا جُگنو

میری پلکوں پر جُگنوؤں کے چراغ
اُس کی آنکھوں میں بجھ گیا، جُگنو

حافظے میں چمکتا رہتا ہے
وہ جو بچپن میں ساتھ تھا، جُگنو

سرد پلکوں پر جھلکتا ہے
ایک آنسو، چراغ سا، جُگنو

بات مجھ سے مستین کرتا ہے
دل کی دیوار سے لگا، جُگنو



ہم سے کیا پوچھتے ہو کیا ہے رات
 اُس کی باتوں کا سلسلہ ہے رات
 آسمان تک جو لے کے جاتا ہے
 ایک ایسا ہی راستہ ہے رات
 فلسفہ رات کا بس اتنا ہے
 اک عجوبہ ہے معجزا ہے رات
 رات کو تم حقیقت جانو
 دن اگر جہ ہے ردا ہے رات
 رات آنکھوں میں کلٹنے والو
 اک تم ہی جانتے ہو کیا ہے رات
 رات کا رنگ رات کی خوشبو
 کون محسوس کر سکتا ہے رات
 رات سو کر گزارتے ہو مستین!
 تم کو معلوم بھی ہے کیا ہے رات



یہوں کسی کو ڈھونڈتے ہو، ہاتھ میں لے کر چہراغ
اب کہاں وہ گاؤں ہوتے تھے جہاں گھر گھر چہراغ

دیکھنا اُس کو اگر ہے ان چہراغوں کو بچھاؤ
کیسے دیکھ گئے اُسے تم، سامنے رکھ کر چہراغ

میں نے چپکے سے کہی، اک بات اُس کے کان میں
اُس نے اپنے ہاتھ سے گل کر دیا مہنس کر چہراغ

اب جو لوٹا ہوں تو سب حیرت سے تنکے ہیں مجھے
جام و مینا، گنبد و محراب، بام و در، چہراغ

آج تو اُن کی نظر کے واسطے سو رنگ ہیں
کل پرندوں کے لیے ہوتے تھے بال و پر، چہراغ

شب تو اندھی ہے رہے گی غم بھرا ندھی مستین
یا جگلو تم شام سے یا پھر تجلیں دن بھر چہراغ



اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہا کورا کا غد
 آئینہ دیکھ کے روتا رہا کورا کا غد

جب کئی چہرے اسے دیکھ کے منہ پھیر گئے
 اپنے اندر ہی سلگتا رہا کورا کا غد

گھر میں جب اس کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی
 بادلوں کی طرح اڑتا رہا کورا کا غد

کوئی آئے، کوئی دیکھے کہ یہاں صدیوں سے
 اپنی ہی آگ میں جلتا رہا، کورا کا غد

کوڑے کا غد کا کہتاں تک لکھوں احوال متین
 سانس لینے کو، ترستا رہا کورا کا غد



کہیں خیال، کہیں خواب سا، بلا دریا
مرے وجود کا اظہار بن گیا دریا

ندی، سکون سے محو سفر رہی لیکن
قدم قدم پہ مگہ نہ نسیتا رہا دریا

اُسے میں اپنے خیالوں میں قید کرنے کا
مرے خیال سے آگے نکل گیا، دریا

ندی نے مڑ کے سمندر کی سمت دیکھا تھا
تو اُس کی راہ میں دیوار بن گیا، دریا

بڑا غرور تھا اپنے وجود پر اس کو
بلا جو آئے، سمندر سے کھو گیا، دریا

وہ شخص ریت میں، منہ کو چھپائے بیٹھا ہے
مستین اُس کو ڈبو دے نہ ریت کا دریا



بھگنے کا اک مسلسل سلسلہ، بارش میں ہے
کیا کسی موسم میں ہوگا جو نہ بارش میں ہے

یوں کھلی سڑکوں پر مت پھرنا کہ موسم غیر ہے
اک تو موسم غیر پھر ٹھنڈی ہوا بارش میں ہے

آسمان کا عکس پانی میں اترتے ہی کھلا
آئینے کے سامنے، اک آئینہ، بارش میں ہے

ایسا منظر بس اسی موسم میں دیکھا جائے
اک کستارا دھوپ میں اور دوسرا بارش میں ہے

سانس لیتے پھل، لچکتی ٹہنیاں، ہنستے گلاب
ایسا منظر بھی سرشارِ حیا، بارش میں ہے

مُجھ سے کم نہیں، یہ زندگی اپنی مستین
جیسے تاریکی میں اک جلتا دیا، بارش میں ہے



ایکلی پھرتی ہے آنکھوں میں لے کے، پانی، شام
متین، ہم سے نہ دیکھی گئی، دوانی شام

نظر کے سامنے، پھیلی ہوئی، شہانی، شام
پلک، تھپکتے ہی ہو جائے گی، کہانی، شام

یہ سلسلہ تو زمانے سے ہے یونہی، جاری
بڑھاپا رات ہے، بچپن ہے دن، جوانی، شام

ہے اس میں ایسی پراسراریت کہ مت پوچھو
کہانیوں کی کہانی، عجب کہانی، شام

کسی کا عکس جو پانی میں آج دیکھا ہے
تو یاد آگئی، بھولی ہوئی، پُرانی شام

پگھلتی ریت کے ذروں میں خواب کے موتی
یہ جاتے جاتے مجھے دے گئی، نشانی شام



شام کا رنگ جو گہرا ہوا آئینے میں
اک ستارہ سا چمکنے لگا آئینے میں

سب کھلونوں کی طرح ٹوٹ رہے ہیں پل پل
اور یہ منظر مجھے دُستا ہوا آئینے میں

گزشتہ وقت سنبھلنے نہیں دیتی مجھ کو
سلسلہ ٹوٹتا، بنتا رہا، آئینے میں

دیکھ کر لہروں کی شوریدہ سری، یاد آیا
ایک چہرہ، کبھی دیکھا ہوا آئینے میں

اُس کی آنکھوں میں اُترتے ہوئے محسوس ہوا
اک نئے شہر کا رستہ بلا، آئینے میں

آئینہ دیکھ کے کیوں چیختے رہتے ہو مستین
کیا کوئی اور ہے بیٹھا ہوا، آئینے میں



میرے احساس کی بکھت، مرے فن کی خوشبو
اے خدا تو نے ہی بخشی ہے، سخن کی خوشبو

جیسے پانی میں اُترتی ہے کرن، سورج کی
مجھ میں اُتری ہے ترے سانولے پن کی خوشبو

زندگی، سازِ مسرت پہ ہو رقصاں بھی تو کیسا
درد ہی سے ہے یہاں گیسوئے فن کی خوشبو

میں نے پہنا ہے تجھے اپنے لباسوں کی طرح
کیسے بھولے گی مجھے تیرے بدن کی خوشبو

میرا اظہار علامت ہے نئے لہجے کی
تم بھی محسوس کرو، میرے سخن کی خوشبو

شاذ و مخدوم و اریب^۱، اختر و جامی^۲ سے مستین
دور تک پھیل گئی، ارضِ دکن کی خوشبو

۱۔ شاذ خلقت ۲۔ مخدوم محی الدین ۳۔ سلیمان اریب ۴۔ ڈاکٹر وحید اختر ۵۔ نوشید جامی

(نذرِ کمار پاشی)

کافذوں کے ٹکڑوں سے آئینہ بناتے ہیں
ہم ہیں کیسے دیوانے، کیا سے کیا بناتے ہیں

وہ عصائے موسیٰ تھا، یہ قلم ہمارا ہے
اس سے ہم بھی پانی میں راستہ بناتے ہیں

اب ہماری بستی کا خشر بھی دہی ہو گا
اب ہمارے بچے بھی زائچہ بناتے ہیں

آنکھ، خواب، تنہائی، دُھوپ، ریت، سناٹا
ان پرانی اینٹوں سے گھر نیا بناتے ہیں

ہم اُداس موسم کے آخری پرندے ہیں
برف زار پر اپنے نقشِ پا بناتے ہیں

رتلیوں کے پر جیسے، خواب میں مستین اپنے
ہاتھ بھی نہیں آتے، سلسلہ بناتے ہیں!

(بشیر بیدر کی نذر)

اب جو ہلتا ہے تو وہ شخص کھنڈر لگتا ہے
اُس کی ٹوٹی ہوئی آواز سے ڈر لگتا ہے

شاخ سے ٹوٹ کے پھیل گرنے کا موسم آیا
اب سنبھالے سے نہ سنبھلے کا شجر لگتا ہے

ریت پر اب جو چمکے ہیں زمرّہ کے چہرا
سُیہ مری آبلہ پانی کا ثمر لگتا ہے

دُھوپ، دیوار سے بل بل کے گلے رتی ہے
اب کی بارش میں بچے گانہ یہ گھس لگتا ہے

اپنی ہی ذات کے اندر کا سفر خوب سہی
قاف تا قاف سفر ہو، تو سفر لگتا ہے

دقت، ہونٹوں پہ دُعا بن کے کرزتا ہے مستین
آج کھل جائے گا وہ بابِ اثر، لگتا ہے!



خُشک دریاؤں کو پانی دے گیا
یاد کا موسم، نشانی دے گیا

دُھوپ کے چہرے پہ بارش کی لکیر
کیسا منظر تھا، کہانی دے گیا

وقت بھی کتنا ستم ایسا رہا ہے
اپنے گھر کی پاسبانی دے گیا

وہ تو آیا تھا، رُلانے کو مگر
عمر بھر کی شادمانی دے گیا

خواب کے سارے پرندے اڑ گئے
وقت، تعبیریں پُرانی دے گیا

زخم پہلے بات کرتے تھے مستین
کون ان کو بے زبانی دے گیا!



نہیں دیکھ لگی، کب جاگتا اچھا لگا
میری آنکھوں کو وہی اک آئینہ اچھا لگا

جب بھی بازاروں سے گزروں تو مجھے پہچان کر
آئینوں کا میری جانب دیکھتا اچھا لگا

جانتے ہیں، رنگ اپنا ہے، نہ پر اپنے مگر
تستلیوں کے پیچھے پیچھے دوڑنا اچھا لگا

شہر کب آئے، کہاں ٹھہرے ہو، یہ کیا حال ہے
اُس کا مجھ کو روک کر یہ پوچھنا اچھا لگا

خُشک پتے ہیں، ہوا ان کو اڑا لے جائے گی
دُشمنوں کو دیکھ کر یہ سوچنا اچھا لگا

اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی جس کے سبب
شام ہوتے ہی مجھے گھر کو ٹٹنا اچھا لگا

دُھوپ ایسی تھی کہ دروازے پر آکر رُک گئی
میرے گھر کو بارشوں کا آسرا اچھا لگا

رات کا ٹو، آہنسی شہروں میں تو محسوس ہو
کیسے ہم کو جنگلوں میں جاگنا اچھا لگا

دور نہ منظر ہی کوئی ہوتا نہ پس منظرِ مستین
اس زمیں سے آسماں کا فاصلہ اچھا لگا



دَریا سے بچانا، نہ سمندر سے بچانا
دیوار کو، دیوار کے پتھر سے بچانا

پانی میں کہیں لاش، کنائے پہ کھڑے لوگ
اس شہر کو ایسے کسی منظر سے بچانا

پوشیدہ جہاں بھی ہے یتیموں کا خزانہ
مجھ کو اُسی دیوار کی ٹھوکر سے بچانا

اک کھیل تھا بچپن کا جو باقی ہے ابھی تک
پتھر کوئی آئے تو اُسے سر سے بچانا

جس کے در و دیوار پہ آئینے لگے ہیں
اب مجھ کو بچانا تو اُسی گھر سے بچانا

یہ دور عجب ہے کہ یہاں سہل نہیں ہے
جس پیڑ پہ پھل ہوں اُسے پتھر سے بچانا

اب اپنے خُدا سے یہی کہنا ہے مستین آج
مجھ میں جو چھپا ہے مجھے اُس شر سے بچانا



مراد دسرا رُخ دکھانے مجھے
مرے سامنے سے ہٹانے مجھے

بڑی دیر سے قید میں ہوں تری
پرندہ سمجھ کر اڑا دے مجھے

میں اُس کے لیے دھوپ اُڑاؤں گا
جو دریلے پانی پلا دے مجھے

میں اُڑنا سکھاؤں گا تجھ کو مگر
تُو پانی پہ چلنا سکھا دے مجھے

سمندر سے نسبت ہے مجھ کو مین
وہ سُورج اگر ہے جلا دے مجھے



کاغذ اُچھال کر ذرا تیور ہوا کے دیکھ
مُحسّی کو پھر ہوا کے مخالف چلا کے دیکھ

منظر کی جستجو ہے تو باہر نکل کے آ
پھل چاہیے تو پیٹر، ذرا سا ہلا کے دیکھ

دیوار و در نصیب سے ملتے ہیں ورنہ یاں
سبزے کو ہم ترستے ہیں، شہروں میں آ کے دیکھ

پانی پہ تیرا نظر آجائے گا کوئی
آنکھوں کی پستیلیوں میں کسی کو بٹھا کے دیکھ

سانپوں کو پالنے کا ہنر ہے، یہ شاعری
میرا کلام، نام سے اپنے سنا کے دیکھ

رُک جائے وقت پھول سے چہروں کے درمیاں
بچوں کے ساتھ شام کو پکنک منا کے دیکھ

بچپن سے جس کا ساتھ رہا سانس کی طرح
ڈول میں اپنے ہاتھ سے اُس کو بٹھا کے دیکھ

آئینہ بات کرتا ہے اپنے ہی عکس سے
صورت کو اپنی اس کے مقابل تو لا کے دیکھ

اُڑتے پرند، ڈوبتا سورج، پگھلتی ریت
دیوارِ جاں پر نقشِ اک ایسا بنا کے دیکھ

خوش رنگ خوش لباس خوش آواز خوش ادا
ہاتھوں سے اپنے ایسا پرندہ اُڑا کے دیکھ

خوشبو، مثالِ برق، چمک جائے گی مستین!
لہجے کے پھول، شاخِ زباں پر کھلا کے دیکھ



جن سے آواز کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا
اُن سے اپنا لب و لہجہ نہیں دیکھا جاتا

پہلے دیکھا نہیں جاتا تھا، پرندہ اس میں
اب یہ حالت ہے کہ پیچرہ نہیں دیکھا جاتا

جن چراغوں کو ہواؤں سے بچالائے تھے
اُن چراغوں کو سسکتا نہیں دیکھا جاتا

پھت کسی کی ہو سکتی نہیں دیکھی جاتی
گھر کسی کا بھی ہو جلتا نہیں دیکھا جاتا

جس علاقے میں ہر گھر ہے وہاں سے دیکھو
اگ لگنے پر بھی شعلہ نہیں دیکھا جاتا

نام لکھ لکھ کے تھیلی پر دکھاتا ہے مجھے
ہاتھ میں اُس کے یہ کانٹا نہیں دیکھا جاتا

میں نے جس شخص کو دریا سے نکالا تھا کبھی
اُس کو دیوار پہ چلتا نہیں دیکھا جاتا

گیوں درختوں کو کھڑے گھومتے رہتے ہو مستین
پھیل گرا نا ہو تو پست نہیں دیکھا جاتا



اِس طرف آگ کا دریا ہے اُدھر کھاتی ہے
ہم نے بھی پار اُترنے کی قسم کھائی ہے

اپنے کمرے سے نکل کر ذرا دیکھو تو سہی
دُھوپ، دیوار سے آنگن میں اُتر آئی ہے

جن چہ راغوں کا ترے نام سے رشتہ ہی نہیں
اُن چہ راغوں کی زولنے میں پذیرائی ہے

رات کی شاخ سے نکلے ہیں ستاروں کے چراغ
گھر کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی تنہائی ہے

ایسا موسم ہے کہ بے برگ و ثمر ہیں اشجار
کیوں ہوا شور مچانے کو چلی آئی ہے

دُھوپ کے شہر میں بادل کو ترسنے والو
آج بارش نہیں ہوگی یہ خبر آئی ہے

جس پہ دیوار کے اُس پار کا منظر نہ کھلے
ایسی بینائی بھی کس کام کی بینائی ہے

اپنے اندر کا یہ عالم بھی عجیب عالم ہے
بھیڑ کی بھیڑ ہے تنہائی کی تنہائی ہے

مجھ پہ الزام ہے آہستہ خرامی کا مہین
تیز چلتا ہوں تو اجاب کی رسوائی ہے



ان پرندوں سے سبق سیکھا کرو
شام ہو جائے تو گھر کو ٹا کرو

روشنی کی سی اگر رفتار ہو
تب کسی آواز کا پیچھا کرو

نیں نہ جیسی نیند پانے کے لیے
رات ہو یا دن فقط جاگنا کرو

ابر ہو تو خوب برسو دشت پر
اور شجر ہو تو کہیں سایا کرو

ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا آپ سے
اپنے اندر بھی کبھی جھانکا کرو

شام، دریا کا کنارہ، اور میں
تم، منگہ، میرا نہ یوں بھیچا کرو

رات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دن کی تاریکی کا اندازہ کرو

شام تنگے پاؤں چل کر آئے گی
ریت پر تم نام تو لکھنا کرو

پھول کھلا جائیں گے آواز سے
اپنے بچوں کو نہ یوں ڈانٹا کرو

رات کی دیوار سے لگ کر مستی
نہیں آجائے تو سو جایا کرو



اب یہ حسرت ہے کہ منظر کوئی ایسا دکھیوں
شام ہو جائے تو سورج کو نکلتا دکھیوں

خواب دہلیز پر آجائیں تو تعبیر کہوں
ورنہ اک قطرہ بے آب میں دریا دکھیوں

چھاؤں جتنی تھی مُقدّر میں سیمٹی اب تو
دھوپ کے شہر میں دیوار نہ سایہ دکھیوں

پھر دہیں سے میں سُناؤں گا کہانی اپنی
ہاں مگر شرط یہی ہے تجھے تنہا دکھیوں

موسم گل ہو کہ پت جھڑ ہو کوئی رُت ہرستین
شاخ در شاخ پر ندوں کو چہرہ دکھیوں



وہ چنگاریوں کو ہوا دے گیا
سمندر تھا لیکن یہ کیا دے گیا

میں جلتے چراغوں کی سانسوں میں ہوں
کوئی جاگنے کی دُعا دے گیا

مشکاری بڑا شعبہ باز تھا
پرندوں کو اک آئینہ دے گیا

میں مقطع پہ پہنچا تو وہ رو پڑا
مجھے شاعری کا صلہ دے گیا

بڑی دُھوپ تھی گھر کے باہر تین
مگر، وہ شجر، اُسرا دے گیا



موسموں کی طرح دل سے مرے جانے والا
یاد آتا ہے بہت، یاد نہ آنے والا

دیکھتے دیکھتے گرتی ہوئی دیوار بنا
رات کی رات وہ دیوار اٹھانے والا

دھوپ آنکھوں میں بسائے ہو جینا ہو گا
پہلی بارش کا وہ موسم نہیں آنے والا

خود ہی تصویر بنا پھرتا ہے شہروں شہروں
تیسری تصویر کو آنکھوں سے لگانے والا

سامنے کی اسی کوٹھی میں رہا کرتا تھا
یہ جو فُٹ پاتھ پہ ہے کھیل دکھانے والا

تم چراغوں کی لویں کاٹ کے رکھ دیتے ہو
”میں چراغ اپنی ہی آنکھوں میں بچھانے والا“^۱

آئینہ دیکھ کے روتا رہا تنہائی میں
شہر کے شہر کو آئینہ دکھانے والا

اُس کی آنکھوں میں مرے نام کی تحریر ملی
نقش پانی پہ بناتا ہے بنانے والا

چاک پر گھومتا رہتا ہوں شب و روز مستین
ہاتھ آیا نہ کوئی، مجھ کو بنانے والا



آئینہ مانگوں تو کیسی وہ سزا دیتا ہے
لے کے ہاتھوں میں اک آئینہ دکھا دیتا ہے

وقت ہے، خواب ہے، خوشبو ہے کہ پیکر کوئی
کون ہے جو مجھے سوتے سے جگا دیتا ہے

ایک چر داہا گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھا
داستاں اپنی پرندوں کو سنا دیتا ہے

موت کے منہ سے کئی بار نکل آیا ہوں
کون ہے جو مجھے جینے کی دُعا دیتا ہے

ایک کمزور سالحہ شب تنہائی کا
مجھ کو خود اپنی ہی نظروں سے گرا دیتا ہے

دن کے ہنگاموں میں ہنستا ہوں، چمکتا ہوں مستین
شب کی تنہائی میں آئینہ رُلا دیتا ہے!



لہجے کو پھول، لفظ کو جُگنو، انگر کریں
وقتِ رواں کے ساتھ معانی، سفر کریں

اندر کی بارشوں نے جو منظر دکھائے ہیں
باہر کی دُھوپ چھاؤں کو اس کی خبر کریں

موسم، پرندے، دُھوپ کی دیوارِ شب چراغ
قصّۂ طویل ہونے لگا، مختصر کریں

اب نیند سی ہے نیند نہ اب خواب ہے خواب
سُرکوں پہ جاگ جاگ کے عُمریں بسر کریں

منظر کو درمیان سے اپنے ہٹا کے دیکھ
محکم ہے پھر مستین کی باتیں اثر کریں



کوئی سایہ نہ خوشبو، مگر دیکھنا
راستوں پر کھڑے ہیں شجر دیکھنا

مشتیو، بادِ باں کھول دینا ذرا
تیسرے جھونکا ہوا کا اگر دیکھنا

بارشوں میں پرندوں کے پر کاٹ کر
اُن کو اُڑتے ہوئے شاخ پر دیکھنا

سبز پتوں سے چھنتی ہوئی روشنی
گل نہ ہو جائے وقتِ سحر دیکھنا

تیری ہٹی ہوں میں تیری ہٹی ہوں میں
کوزہ گر دیکھنا، کوزہ گر دیکھنا

جن کی آنکھوں میں پانی کی تحریر تھی
 اُن کے ہونٹوں پہ رقصِ شرر دکھنا

بچ پانی کے سب کشتیاں جل گئیں
 پار اُتریں گے ہم اے بھنور دکھنا

ہم فقیروں کو کیوں چھڑتے ہو میاں
 تم بھی ہو جساؤ گے در بدر دکھنا

خواب ہی سوچنا، خواب ہی بولنا
 خواب ہی دیکھنا، غم بھر دیکھنا

گیلے کاغذ پہ کیسے لکھو گے مستین
 دھوپ نکلے تو اپنا ہنر دکھنا



شعلے بجھ جائیں گے، چنگاری دُبی رہ جائے گی
قہقہوں کے بعد آنکھوں میں نمی رہ جائے گی

بانیوں میں عکس، سُورج کا پگھلتا جائے گا
شام آنکھوں میں لیے آنسو، کھڑی رہ جائے گی

اک صدائے بے کراں ہے زندگی اور اُس کے بعد
خامشی ہی خامشی ہی خامشی رہ جائے گی

گفتگو دیوار سے کرتے رہو گے تم اگر،
دُھوپ، دروازے پر رُک کر سوچتی رہ جائے گی

وقت، دریا پار کر جائے گا سنستے، کھیلتے
تیرے میرے درمیاں، دیواری رہ جائے گی

گرتی دیواروں سے لگ کر مُت کھڑے رہنا مستین
دُرنہ بلبے میں دُبی اک پتھر سی رہ جائے گی



یہی نہیں کہ فقط در بہ در گئے ہوتے
تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو مر گئے ہوتے

ہمارے پاس اگر کوئی معجزہ ہوتا
تو اس زمین کو گلزار کر گئے ہوتے

کھلی فضا سے زیادہ اگر سکون ملتا
پرندے، شام سے پہلے ہی گھر گئے ہوتے

یہ وہ گلی ہے جہاں آسمان بھی جھکتا ہے
اب اس گلی سے نکل کر کدھر گئے ہوتے

مستین، نسبت اس حد اگر نہیں ملتی
تو شل آئینہ، گر کر بکھر گئے ہوتے

حضرت قبلہ سید اسعد حسین ہارونی مدنی المعروف حضرت مولیٰ پاشا صاحب قبلہ



خود اپنے شکبجے میں گرفتار نہ ہونا
ہونا بھی پڑے تو سب بازار نہ ہونا

دیوار کو ڈھانا بہت آسان ہے لیکن
مشکل ہے کسی کے لیے دیوار نہ ہونا

اس راہ میں آگے کوئی دریا بھی ملے گا
تم اُس سے گزرتے ہوئے بیزار نہ ہونا

جانے یہ ہواؤں کی شرارت ہے کہ عادت
موسم کے شمر کا سراشبکار نہ ہونا

ہم جیسے بُرے لوگ بھی یاد آئیں گے تم کو
پر دیس میں رہ کر کبھی بیمار نہ ہونا

یہ دام، یہ دانہ، یہ شکاری ہے پرندہ
جب پر ہیں تمہارے تو گرفتار نہ ہونا

مجھ سے مراسیہ یہی کہتا ہے مستین آج
دیوار نہ ہونا، کبھی دیوار نہ ہونا



کیا ہوا، پوچھیں، تو وہ، کچھ بھی نہیں کہتی ہے
دھوپ، دیوار کے سائے میں کھڑی رہتی ہے

ریت آنکھوں میں لیے جاگتے رہنے والے
گھر کی دہلیز، ترا نام لب کر تی ہے

تم نئے آتے ہو، اس شہر میں، اتنا سن لو
سائباں اڑتے ہیں، جب تیز ہوا چلتی ہے

آسمانوں میں، پرندوں کی طرح اڑتا ہوں
میرے اس خواب کی تعبیر بتا، کیسی ہے

کَم سے کَم دُھوپ میں سایہ تو مجھے ملتا ہے
 اِن درختوں سے وہ دیوار بہت اچھی ہے

اُس کا لہجہ ہے کہ بچوں سے ٹپکتی شبِ نیم
 بات کی بات ہے سرگوشی کی سرگوشی ہے

تم سمجھتے ہو، بچھاتی ہے چسراغوں کو ہوا
 ہم یہ کہتے ہیں، چراغوں میں ہوا بجلتی ہے

تم نے پوچھا ہے تو بس تم کو بتاتا ہوں متین
 صُبح ہوتی ہے کہیں، شام کہیں ہوتی ہے



دل جلا پھر چراغ جلتے ہی
اپنے دکھ بھی ہیں شام جیسے ہی

کھٹنے چہرے اُتر گئے دکھو
دُھوپ دیوار سے اُترتے ہی

موسموں کا پتہ چلا مجھ کو
رنگ دیوار کا بدلتے ہی

ہم نے دریا میں راستہ پایا
اک ترا نام کے چلتے ہی

زندگی کتنی خوبصورت ہے
ہاں مگر سانس کے اکھڑتے ہی

میر کی یاد آگئی ہم کو
صبح کرتے ہی شام کرتے ہی

ایک زندہ مثال تھی نہ رہی
ہائے اُس آدمی کے مَرتے ہی

ٹوٹنا اپنے دل کا یاد آیا
اُتیسنہ ٹوٹ کر بکھرتے ہی

تیرا ہجو مستین ایسا ہے
پھول جھڑتے ہیں بات کرتے ہی



دُشمن کو بھی یار بن کر دیکھیں گے
آتش کو گُلزار بن کر دیکھیں گے

کون عیادت کو آتا ہے، کون نہیں
خود کو اب بیمار بن کر دیکھیں گے

جو ڈو اور کر لے گا فن سیکھیں گے
ہاتھوں کو تلوار بن کر دیکھیں گے

بہت ہوا اب چل کر اپنا گھر ہم بھی
سات سمندر پار بن کر دیکھیں گے

کیسا پتہ کہہ رہا ہے ان لفظوں سے
لفظوں کو زرتار بن کر دیکھیں گے

ٹی۔ وی، وی۔ سی۔ آر، سبھی کچھ ہے گھر میں
اب اک چھوٹا بار، بنا کر دکھیں گے

آنکھوں کے دریا میں کون اُترتا ہے
پانی میں دیوار، بنا کر دکھیں گے

یہ سوچا ہے آئینے میں اب خود کو
سرتاپا اظہار، بنا کر دکھیں گے

منغی، مصحف، خالد اور قدیر زماں
ان پھولوں کا، ہمار بنا کر دکھیں گے

انسانوں کے اس جنگل میں آج متین
چہرے کو اخبار، بنا کر دکھیں گے

ٹی۔ وی، وی۔ سی۔ آر، سبھی کچھ ہے گھر میں
اب اک چھوٹا بار، بنا کر دکھیں گے

آنکھوں کے دریا میں کون اترتا ہے
پانی میں دیوار، بنا کر دکھیں گے

یہ سوچا ہے آئینے میں اب خود کو
سرتاپا اظہار، بنا کر دکھیں گے

منغی، مصحف، خالد اور قدیر زماں
ان پھولوں کا، ہمار بنا کر دکھیں گے

انسانوں کے اس جنگل میں آج متین
چہرے کو اخبار، بنا کر دکھیں گے



دریا سے بچانا نہ سمندر سے بچانا
دیوار کو، دیوار کے پتھر سے بچانا

غیاث متین

سفرِ شرط

(پاکستانی شاعروں، ادیبوں اور دوستوں کی نذر)

وہ کون تھے؟

سحاب تھے، کتاب تھے،

مرے ہر اک سوال کا

جواب تھے،

کہ خواب تھے،

وہ کون تھے؟

ستارے تھے،

کہ آسماں سے روشنی لیے ہوئے

زمین پہ آگئے تھے،

میرے واسطے

وہ کون تھے؟

وہ ہم قلم، وہ ہم زباں
وہ ہم یقین، وہ ہم گماں
وہ ہم خیال و ہم بیاں

وہ یوں ملے
کہ جیسے حافظے سے یاد
جیسے تشنہ منیوں سے بارشیں
کہ جیسے شام کو پرند
گھوٹسوں سے جا ملیں
کہ جیسے رگ زار کو
اماں ملے حیات کی
کہ جیسے میری ذات کو
اُذاں ملی ہو ذات کی
وہ یوں ملے —

تُو اے زمین و آسماں کے نور
 میرے مدعا
 میں خواب دیکھتا ہوں
 دُھونڈتا بھی ہوں بشارتیں
 اُنھیں بھی
 خواب دیکھنے
 نظر ملے
 یقین تراشنے، گُماں سے بھاگنے
 ہنسر ملے، سفر ملے

وہ ظُلم ہو کہ خوف ہو
 وہ زخم ہو کہ چوٹ ہو
 عذاب یا عتاب ہو
 اُنھیں بچاے رکھ
 تُو اے میرے خُدا —

میں جب ہوں، تو یوں ہوں
 وہ جب ملیں، تو یوں ملیں
 کہ جیسے صبح، شام سے
 کوئی خود اپنے نام سے
 کہ جیسے دُھوپ، چھاؤں سے
 غریب شہر، گھاؤں سے
 کہ جیسے لب، دُعاؤں سے

وہ یوں ملیں
 میں یوں ہوں
 میرے خدا
 ہے یہ دُعا
 یہی دُعا



زخمی سُرک

میری آنکھیں،
اُٹی ہیں گرد سے پھر بھی
میں سب کچھ دیکھ سکتی ہوں۔

زمین پر
گاؤں نے
جب رُوپ دکھارا
شہر کا
تب سے
سحر کی آنکھ کھلتے ہی
اُسے پھر نیند آنے تک
ہزاروں نقشِ پابنتے، بگڑتے ہیں
کئی مانوس ہیں ان میں
کئی ہیں اجنبی لیکن
سبھی یہ چاہتے ہیں
یاد رہ جائیں زمانے کو۔

سحر کی آنکھ کھلتے ہی
 اُسے پھر نیند آنے تک
 نہ جانے کتنے رکشے، سائیکلیں، موٹر
 مجھے یوں روند کر
 اگے کو بڑھتے ہیں
 کہ جیسے میں نے اپنا جسم
 اُن کو بیچ ڈالا ہے۔

میں راہوں کا
 مقدر ہوں
 رستم دیکھو
 میرے سینے پر پھوڑے پھنسیاں اب بھی
 گڑھوں کی شکل میں
 پھیلی ہوئی ہیں۔

مجھے کچھ یاد آتا ہے
 کبھی میں بھول جاتی ہوں
 برے اطراف تھیں
 کچھ ٹوٹی پھوٹی ملکیاں کل تک
 وہیں پر آج ایسی بڑنگیں ہیں
 جنہیں میں دیکھ کر
 حیران بھی ہوں
 اور خوش بھی ہوں

سنا ہے
 میں نے یہ اکشر
 سمندر پار ملکوں میں
 برے ہم جنس، مثل آئینہ ہیں۔
 اور اُس میں
 زین کے چاند سورج
 اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔

اس اندھے شہر میں
 آئینہ بننے کی لیے حسرت
 میں زندہ ہوں

مگر اب سوچتی ہوں
 کوئی اک صُورٹھو بچوئے
 صُورٹھ کی آواز سے
 ہر شے پگھل جائے
 زمین مجھ کو بھی

اپنی گود میں لے کر
 خلاؤں میں اڑے
 سورج سے بل جائے!

شہرِ یارِ امروز

سنا تھا ہم نے کبھی یہ
 کہ شہرِ یار تھا اک
 وہ شہرِ یار جہاں
 جس کو آرزو تھی 'ملے'
 صدف کے دل میں نہاں
 گوہرِ تبسمِ ریز
 رستم ہوا کہ اُسے
 وہ گمہرِ ملے بھی تو یوں
 مثالِ شبِ نیمِ کزائے مثالِ آبِ رواں
 بس ایک پل کو ملے
 دوسرے ہی پل پھٹے! —

وہ شہرِ یارِ جہاں
 راستے کی دُھول بنا
 صبا کے پاؤں میں
 زنجیر پڑ سکی نہ کبھی
 کسی بھی پھول کی خوشبو
 اسپر ہو نہ سکی —

تب اُس نے حکم دیا
 ”ساکنانِ شہرِ سنو“
 ہر ایک شب کی جبین پر
 لکھا ہو میرے لیے
 ”شبِ عروس — مگر
 ہاں — سحر کے ہوتے ہی
 مثالِ شمع
 ہر اک نرِ عروس قتل بھی ہو“ —

پھر اُس کے حکم کی تعمیل

اس طرح سے ہوئی

وہ شہر

جو تھا، زمیں پر

نمونہ جنت

اُسی پہ شہرِ خوشاں کا

ہو رہا تھا گماں

صبا، زمر و نیلم

ہر ایک شب کے لیے

بہنیں عروس

سجے بامِ دُور

سُحر ہوتے

ہوے تھے قتل

چراغوں کی روشنی کی طرح! —

وہ شاہزاد تھی،
 جس نے کیا اسپر اُسے
 ہر ایک رات،
 نئی ایک داستان کہہ کر
 وہ شہر یار ہی تھا،
 جو ہوا اسپر کبھی
 یہ شہر یار، وہ ہیں
 جن کی آستیں کا لہو
 پکارتا ہے کہ قاتل ہو تم
 مسیح نہیں

نہ جانے کتنے شب دروز کٹ گئے
 کہ یہ سب

کہانیاں بھی سناتے ہیں
 قاتلِ عام کے ساتھ !!

صدائے طُور

شہرِ دیواراں کے مکینو
یہ سنو

تم فقط

نقش بہ دیوار رہے

مجھ کو دیکھو کہ میں

آئینہ بنا

دیکھ رہا ہوں کب سے

بہتے دریاؤں کے سینے پہ

جو کلاچ ہیں کشتی میں سوار —

اُگ لینے کو،
 کئی بار گئے تھے لیکن،
 لوٹ آئے تھے لیے، کوئلہ اور راکھ کا ڈھیر
 طور سے آئی صدا

آج حمیراں ہوں کہ جب
 اُن کی وہ کشتی ہوئی
 گرداب کے ہاتھوں میں اس پر
 ڈوبتے ڈوبتے
 ابھرے ہیں وہ قندیل بہ کف
 جس کے شعلے کی زباں پر ہے لکھا
 ”میں اُجسالوں کا نقیب“
 مجھ کو تھامے
 بو بڑھو گے،
 تو سنو —

آج پھر
 طُور سے آتی ہے صدا
 شہرِ دیرِ ال کو
 جو گنزار بنا ہے
 تو پھر —

دُوب جانے دو انھیں
 اپنے کاسے میں لیے
 کوئلہ اور راکھ کا ڈھیر
 اور اگر وہ جو کنارے سے لگے
 کاٹ کر
 شعلہٴ آفتوں کی زباں
 پھر سے کر لیں گے
 اُجالوں کو اسپر! —

کل جہاں
 دُھوپ میں لپٹی تھی
 شبوں کی رنگت
 اور جہاں
 خواب میں
 دیواریں کیا کرتی تھیں
 باتیں خود سے
 دہیں
 گونجنے کی صدا کی خوشبو
 تہقہ ٹوڑ کے
 بکھریں گے وہیں

وقت

وہ دیرِ روز کی شام
 کب لوٹ کر آسکی ہے
 نظر جس کی امروز و فردا کے چہروں پر مرکوز ہے
 وہی اس سفر میں
 اُفق زاد ہے!

پُرندے بھی مہمان ہیں موسموں کے
 جہاں اُن کو پانی ملے
 اُڑ کے اُس سمت جاتے ہیں
 پیچھے پلٹ کر کبھی دیکھتے ہی نہیں! —

عجب یہ تمہارا سفر ہے
 عجب یہ تمہاری نظر ہے
 کہ صدیوں سے دیر وز کے اُس کھنڈر پر لگی ہے
 جہاں تم کو ملتے ہیں، تاریخ کے
 پارہ پارہ سے بوسیدہ اوراق
 جن کی نشانی فقط
 وقت کے پاس ہے۔

سُنو،
 وقت کی آنکھ ہے
 وہ سب دیکھتا ہے،
 نظر میں ہے اُس کی
 زمان و مکاں
 باؤر لائے زمان و مکاں —

دقت کے ہاتھ ہیں
 وہ اپنے ہی ہاتھوں سے
 شکلیں بناتا بھی ہے
 اور شکلوں کو لمحوں میں تقسیم کر کے
 پھینک دیتا ہے اُن کو
 ابد کے کنارے پر ٹوٹی ہوئی
 کشتیوں کی طرح

دقت کے پاؤں ہیں
 وہ چلتا ہے
 گردش لگاتا ہے
 بس ایک ہی سمت میں
 اُس کی رفتار ایسی ہے جیسے کوئی
 خواب میں
 رات کو
 دن سمجھ لے !

دقت، آواز ہے
 دقت، احساس ہے
 دقت، پتھر نہیں
 دقت، سیلِ رواں
 دقت، محور ہے
 جس پر زمیں چل رہی ہے !

دقت، سورج ہے
 کونوں سے اپنی
 زمیں کو رُلاتا بھی ہے اور ہنساتا بھی ہے !

دقت، بارش ہے
 طُوفان اُٹھاتا ہے
 بیجوں کو، پھولوں، پھلوں تک کا سب فاصلہ
 طے کر آتا ہے
 دقت، سیلابِ بَن کر پہاڑوں کی چوٹی پہ چڑھتا ہے
 پانی میں رستہ بناتا ہے
 آتش کو گلزار کرتا ہے
 اور رات کی رات سوئی ہوئی بستیوں کو اُلٹا ہے ! —

وقت 'موسم' ہے
 پت جھڑکی صورت میں سائے درختوں کے پتے
 گرانا بھی ہے
 پھر انھیں
 اک نیا پسیر بن بخش دیتا ہے !

وقت 'عادل' ہے
 انصاف کرتا ہے
 راتوں میں وہ بھیس اپنا بدل کر نکلتا ہے
 حاتم ہے
 بن مانگے خیرات کرتا ہے !

وقت 'قاتل' بھی ہے
 اور مسیحا بھی ہے
 زخم دیتا بھی ہے
 زخم بھرتا بھی ہے !

وقت کو تم اگر جان لیتے
 تو یوں ریت میں منہ چھپا کر نہ روتے
 زمیں کی کراہیں نہ سُنتے ! —

ابھی وقت ہے
 اُس کی آنکھوں میں جھانکو
 نہ تم وقت کو قید رہ کر سکو گے
 نہ تم وقت کے دائرے سے نکل کر
 کہیں جا سکو گے !

ازل اور ابد کے کنارے بھی
 اک واہمہ ہیں
 حقیقت تو یہ ہے
 ازل اور ابد سے پرے
 وقت کا دائرہ ہے

وہ دیرِ وز کی شام
 کب لوٹ کر آ سکی ہے !
 نظر جس کی امروز و فردا کے چہروں پر مرکوز ہے
 وہی اس سفر میں
 اُفقِ زاد ہے !

”وہ قاصد‘ مرچکا ہے!“

پرندے
رات کی شاخوں پر بیٹھے ہیں
پروں میں
اپنی چونچوں کو دبائے
اُونگھتے جلتے ہیں
اور یہ سوچتے ہیں

وہ قاصد
جو گسیا تھا
صبح کا چہرہ
کہیں سے مانگ کر لانے
ابھی تک لوٹ کر آیا نہیں ہے! —

وہ قاصد
 صُبح کے ہمراہ
 کب آئے گا
 کب اس آسماں کے
 زرد و رخساروں پہ سُرخ دُور جائے گی

پرنڈے
 اُونگھتے جلتے ہیں
 ادھر یہ سوچتے ہیں
 اُنھیں مُردہ —
 وہ قاصد
 مَرچکا ہے!
 اُنھیں مُردہ —
 کہ اُن کے پر سلامت ہیں۔

وہ اُتریں
 رات کی شاخوں سے اُتریں
 خلاؤں کے سمندر پر چلیں
 اور صُبح کو

اپنے پردوں سے
 باندھ کر لائیں! —

ریش

وہاں بھاؤ اچھا ملا تھا
 کوئی چار چھ، لیتھ کی
 بات بھی تو نہیں تھی
 بس آخر میں گردن سے
 گردن ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا۔
 وہ جاکی، کہ جس پر
 بھروسہ تھا مجھ کو
 اُسی نے کہیں.....
 نہیں — ایسا ممکن نہیں ہے —
 تو پھر؟ —

حسب اور نسب
 شجرۂ خاندانی،
 سبھی دیکھ ڈالا تھا میں نے،
 وہ رستم کا بیٹا تھا،
 شہراب ہی تھا
 وہ جس پنج میں تھا
 وہاں کوئی اس کا مقابل نہیں تھا!

وہ پھیلتے کی مانند اڑتا تھا،
 اور وزن بھی
 پیچھے پر
 اُس کی اتنا نہیں تھا
 کہ وہ ہار جاتا
 ٹرینر بھی ماہر تھا اس کا
 پھر اس کے وہ سب کارنامے.....

اُدھر اس کی فوٹو نکلنے کو تھی
 اور اُدھر
 دل کی رفتار.....

کوئی چار چھ لیتھ کی بات بھی تو نہیں تھی
 وہاں صرف گردن سے گردن ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا
 چلو مان لیتے ہیں
 پھر آج اپنے ستارے ہی اچھے نہیں تھے
 ”چلو، آؤ رکشہ سے چلتے ہیں سسرل“
 ”نہیں یار،“

اب اتنے پیسے کہاں ہیں؟

○

مُحْصَل جاسم

لکڑہارے،

دہیں کی لکڑیاں کاٹیں

دہیں ریلوڑ چرائیں،

دھوپ سے،

سبزے کا

جورشتہ ہے،

دہ رشتہ اُسکائیں

کُنویں کے ٹٹھے پانی سے

پتواغ اپنے جھلائیں۔

چلو اس شہر سے

اور شہر کے لوگوں سے

جتنی دُور ممکن ہو

نکل جائیں،

اُسی جنگل کی جانب

جہاں سے

آئے تھے

ہم تُم !

لکڑا ہے

یہاں تو

عسلی بابا

اور اُس کا بھائی قاسم

وہ مزہینا ہوا ہو مصطفیٰ درزی

کہ ہوں چالیس ڈاکو

سبھی اس شہر کی دیواریں محصور

بسم
بھول بیٹھے ہیں!

لکڑا ہے

طلبہ شہر میں اُن کو

یونہی، حیران، پریشان، چھوڑ کر نکلیں

اُمی جٹل کی جانب

جہاں پر

پرندے یہی مگر

ایسے نہیں ہیں

دندنے ہیں مگر

ایسے نہیں ہیں!

پَرندو، چلو لوٹ آؤ!

تمہیں یاد ہو گا
کہ، اک دن
تم اپنے درختوں کو
جب چھوڑ کر جا رہے تھے
تو دریا نے اپنے ہی پانی سے
پانی نے دریا سے سرگوشیاں کیں
(مگر، تم نے تب بھی پلٹ کر نہ دیکھا)

جب اُس پار پہنچے
تو دریا نہ پانی
فقط ریت ہی ریت تھی! —

ریت کے اُس سمندر سے اُڑ کر
 تم اپنی زمین کی طرف
 جب بھی آتے
 تو، اپنے پروں اور چوٹیوں میں
 بس، ریت بھر بھر کے لاتے

پرتدو
 تمہیں ریت کو
 آپ زرمیں بدلنے کا
 اک نسخہ کیا رہا گیا ہے
 اُسی کے پروں پر
 وہاں، حیرتوں کے نئے آسمانوں میں
 تم اُڑ رہے ہو
 مگر.....
 اس زمیں پر
 نیا ایک منظر ابھرنے لگا ہے —

وہ شاخیں

کہ جن پر

بسیرا تمہارا کبھی تھا

وہ شاخیں پرندو

ہوا کے ذرات پر جھونکے سے بل کر

کسی دوسرے پریر کی سمت ٹھکنے لگی ہیں۔

وہ پودے

جنہیں چھوڑ کر تم گئے تھے

وہ اب پیڑ بننے لگے ہیں

وہ کلیاں بھی اب

پھول بن کر مہکنے لگی ہیں

(وہ بھنورے جنہیں تم نے دیکھا نہیں)

ان کے اطراف سنڈلا رہے ہیں

یہ منظر

تمہیں ڈھونڈتا ہے

پرندو

چلو، کوٹ آؤ!

اپنے آپ سے
ایک مکالمہ !

”نہیں — یہ ”میں“ — نہیں ہوں —

”میں“ — نہیں ہوں ؟

اور اگر یہ میں نہیں ہوں

کون ہے وہ —

جو مجھے آواز دیتا ہے

میری ہی ذات کے اندھے کنوئیں سے

اور اگر یہ ”میں“ نہیں ہوں

کون تھا — جو اب نہیں مجھ میں !

وہ ”میں“ ہی تھا

جو کل

پانی پہ چلتا تھا

ہواؤں پر بھی میری حکمرانی تھی

بلندی سی بلندی بھی

بہت کم تھی

میری پرداز کے آگے ! —

پرندوں کی زباں آتی تھی مجھ کو
 گفتگو کرتا تھا میں اُن سے
 میں کل —

آواز کے چہروں کو پڑھتا تھا،
 سمندر، چاند، سورج اور ستارے بھی
 مرے قدموں میں اپنا سر جھکاتے تھے،
 مگر اب — میں کہاں ہوں؟
 ”ہاں — وہ تم ہی تھے“
 مگر اب تم کہاں ہو؟

کوئی اب کیوں کر مجھے ڈھونڈے
 میں خود کو کھوجکا ہوں
 آسمانوں سے زمیں کا فاصلہ جتنا ہے
 اتنا فاصلہ
 خود میرے اپنے دریاں کیوں آگیا ہے
 دقت دریا کی طرح چلتا رہا
 اور یاں کسی نے بھی
 مجھے رد کا نہیں
 اُس سمت جانے سے! —

جہاں سے مڑ کے دیکھا تھا
 تو میں پتھر بنا تھا
 آج بھی پتھر بنا پھرتا ہوں، ہر سو
 اس زمیں پر
 آسمان پر
 اور خلاؤں میں
 سمندر پر
 ہواؤں میں
 بری وحشت نے مجھ کو
 ہر جگہ رسوا کیا ہے !

اب کوئی آپ بقا لا دے
 کوئی میری خبر لا دے
 کہاں ہوں میں ! —

”کہاں ہو تم؟“

”یہ اپنے آپ سے پوچھو“

یہ اپنے آپ سے پوچھو!

نہیں — یہ میں نہیں ہوں

اور اگر یہ میں نہیں ہوں

کون ہوں میں

کون تھادہ —

کون ہے یہ —

جو میرے اندر سے

رہ رہ کر مجھے

آواز دیتا ہے!؟

ایک نظم ”زمین والوں کے نام“

ہوا

کچھ ایسی چلی

کہ خیمے اکھڑ گئے ہیں !

غبار ایسا غبار اٹھا

کہ دھول آنکھوں میں جم گئی ہے

پسراغ بھڑکیں

تو اس میں ان کا تصور کیا ہے ؟

شمال کی

یہ ہوا

کچھ ایسی شریر دُستاخ ہے

جو بڑھ کر

بھڑکنا ان کو سکھا رہی ہے

جسلا رہی ہے

بجھا رہی ہے

ہوا کچھ ایسی چلی کہ خیمے اکھڑ گئے ہیں !

چراغِ دُوزخِ طرفہ کے
 اتنے بجھے کہ منتظر بھی رو رہا ہے!
 سیہ لبادوں، سیہ نقابوں کا راج ہر سُو
 کہاں کے رشتے
 کہاں کے ناطے
 کہاں کے رستے
 کہاں کی منزل؛
 چہار سمتوں میں آگ ایسی لگی ہوئی ہے —
 بجھنا چاہیں تو بڑھ رہی ہے!
 بدنِ دریدہ، کفنِ دریدہ، پٹری ہیں لاشیں
 سروں سے آنچل
 بدن سے زیور
 اتر چکے ہیں
 جو خواب دیکھے تھے ہم نے
 وہ خواب —
 مر چکے ہیں!
 ہوا کچھ ایسی چلی
 کہ خیمے اکھڑ گئے ہیں! —

ہمارے گھر میں
 تمام چہرے تھے روشنی کے
 تمام چہروں سے روشنی تھی
 وہ غمیر تھے !
 یہ سنا تھا میں نے
 مگر میں جن پر
 دُعا میں پڑھ پڑھ کے پھونکتا تھا
 وہ میرا گھر پھونکنے کو آئے !
 بس ایک دیوار بیچ میں تھی —
 وہی پڑ دی بھی آئے
 خنجر بہ دست آئے !
 یہ کیسی آندھی چلی کہ چہرے بگڑ گئے ہیں
 ہوا کچھ ایسی چلی کہ خیمے اکھڑ گئے ہیں !

نہ کوئی اخبار ہے جو کچھ میں
 پھول جیسا کھلا ہوا ہے
 نہ ریڈیو میں خبر کی خوشبو
 نہ دور درشن میں ہے وہ منظر
 جو مجھ کو
 سورج دکھا رہا ہے ! —

اسی زمیں پر
 رُشی، مُنی اور نبی بھی آئے
 تمام سمتوں کے واسطے
 اک پیغام لائے —
 مگر، میں آتسا ہی جانتا ہوں
 زمین پر ظُلم ہو رہا ہے
 زمین والے ہی کر رہے ہیں

وہاں فرشتوں نے سچ کہا تھا
 مگر خدا جانتا تھا سب کچھ
 (وہ آج بھی جانتا ہے سب کچھ)
 وہ 'آسمان سے
 اُتر کے —

اپنی زمیں پر آئے گا
 بھول جاؤ ! —
 وہ اپنے ہاتھوں سے
 اس زمیں کو
 'حسین بنائے گا'
 بھول جاؤ ! —

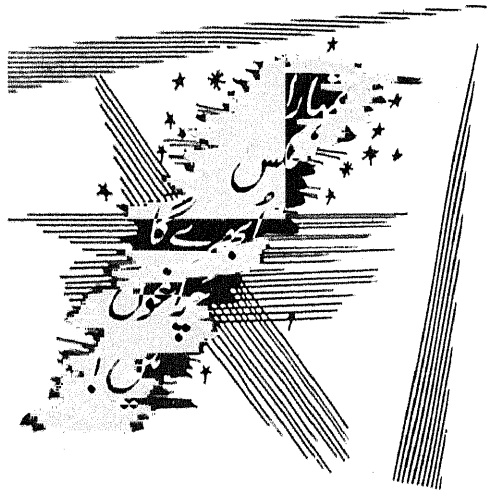
چراغ اندر چراغ — تم ہو
 کتاب اندر کتاب — تم ہو
 سوال اندر سوال — تم ہو
 جواب اندر جواب — تم ہو
 خدا نے روزِ ازل
 جو دیکھا تھا خواب — تم ہو

تمہیں سے عسرت
 تمہیں سے نکبت
 تمہیں سے شہرت
 زمین کی ہے —

بچا سکو تو
 اسے بچا لو

زمین والو —

زمین والو! —



بُجھے ماضی کا کھلتے حال سے رشتہ عجب دیکھا
 کھنڈر خاموش ہیں لیکن صدا دیتی ہیں دیواریں
 غیشا متین

وہ ایسا آئینہ تھا۔۔۔
— عالمِ خوندا میری لکھ نام —

وہ موسیٰ تو نہیں تھا
ہاں مگر۔۔۔ جب
اپنی لالٹھی پھینک دیتا تھا
تو وہ بھی
اُتر دہا بن کر
نگل جاتی تھی سارے اُتر دہوں کو

وہ موسیٰ تو نہیں تھا
ہاں، مگر۔۔۔ اُس نے بھی
اپنے وقت کے دریا پہ لالٹھی مار کر
اک راستہ اُس میں بنایا تھا۔۔۔

نہیں — وہ ابنِ آذر بھی نہیں تھا
 لیکن اُس نے
 کتنے ہی بُت
 اپنے ہاتھوں سے گرائے،
 توڑ ڈالے تھے!

اُسے معلوم تھی
 شے کی حقیقت
 اور اُسے معلوم تھا یہ بھی
 کہ شے کے درمیاں
 اک آگ رہتی ہے! —
 مگر اُس کے
 لبوں کے درمیاں
 بس، پھول کھلتے تھے! —

سمندر پی کے تشنہ تھا
 چمکتی پیاس تھی،
 آنکھوں میں
 باتوں میں
 اک ایسی آس تھی
 جو ڈوبتے، بجھتے دلوں کو بھری
 بھنور سے
 کھینچ لاتی تھی،
 اُمیدوں کے کناروں پر —

مکتا بوں کی زمیں پر
 جاگتی راتوں میں تنہا
 طے کیے کتنے سفر، اُس نے
 دُکٹی آنکھیاں — آنکھیں تھیں اُس کی
 بے جہی کے شہر میں — جو
 خواب کی دیوار کے اُس پار
 سب کچھ
 دیکھ لیتی تھیں

وہ ایسا آئینہ تھا
 جس کو پت جھڑپ بھی روزانہ آتا تھا
 گزرتے موسموں سے بھی
 جو آسودہ نہ ہوتا تھا

وہ خوابوں کا تماشائی
 وہ خوابوں کا تماشائی
 وہ جس کے واسطے
 بس خواب ہی
 آنکھوں کی بینائی
 وہ جس کی ذات میں
 غم ہو گیا تھا
 سحر گویائی

جیسا ایسے کہ جیسے پھول کھلتے ہیں
 بیاباں میں
 مرا۔ ایسے کہ جیسے دھوپ ڈھلتی ہے
 خیااں میں —

کتابِ فہمِ دانش میں
 نگاہِ اہلِ بینش میں
 وہ ایسا آئینہ تھا
 منعکس ہوتی تھی
 جس سے دُھوپ بھی
 اور چاندنی بھی!

ذہن تھا ایسا
 ہزاروں ذہن
 روشن کر دیے جس نے
 اور ان ذہنوں کو
 اپنی زندگی ہی میں
 خود اپنی موت پر
 ہنسنا سکھایا تھا
 وہ ایسا آئینہ تھا.....

بولتی لکیریں

(تَنْذِرِ مَحْدُومِ)

مخوابِ زلیست ہو
ظلمات ہو

کہ روزِ ن ہو —

شعاعِ مہر کی صورتِ وہیں سے پھنتی ہیں
یہ بات کرتی لکیریں

انہی لکیروں میں

کہیں دھنک ہے

کہیں چاندنی

کہیں خوشبو

کہیں خیال

کہیں خواب

اور کہیں تعبیر! —